آل احمد سرور

جدید دنیا میں اسلام۔ مسائل اور امکانات

جدید دنیا ایک ایسی حقیقت ہے، جس کے پیچھے ایک سائنسی نظر، ایک جدید کاری کا عمل، ایک صنعتی نظام، ایک سماجی انقلاب، ایک جمہوری سفر، ایک اخلاقی رویہ ہے۔ اسے نہ تو محمد حسن عسکری کی طرح گمراہیوں کا سلسلہ کہا جاسکتا ہے، نہ کچھ تہذیب کے فرزندوں کی طرح انسانیت کی نجات کا واحد راستہ۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم وقت کے سمندر میں اس موج کو خلاصہ کائنات نہ سمجھیں بلکہ وقت کا عرفان حاصل کریں، اور ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ اس موج کی عظمت اور طاقت کو بھی ذہن میں رکھیں۔

جدید دنیا کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس کی طاقت اور کمزوری کیا ہے؟ کن عناصر سے اس کی تشکیل ہوئی ہے اور انسانیت کو اس نے کہاں پہنچایا ہے؟ کیا جدید دنیا مغربی اثرات کی نمود کا دوسرا نام ہے؟ کیا اس کا محور مغربیت ہے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات، جدید دنیا کا نام آتے ہی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان سب کا مختصر اور شافی جواب آسان نہیں ہے۔ پھر بھی یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ جدید دنیا کی پہلی خصوصیت روایتی نقطہ نظر کے بجائے عقلی اور سائنسی

نقطہ نظر ہے۔ عقلی اور سائنسی نقطہ نظر کے نشانات جدید دور سے پہلے بھی ملتے ہیں، مگر اس کی حکمرانی نہیں ملتی۔ چنانچہ روایتی سماج سے عقلی سماج تک ترقی، جدید دور کی خصوصیت ہے۔ اس دور میں رنگ، نسل، حسب نسب کے بجائے ذاتی صلاحیت معیار بنتی ہے۔ ترقی ایک قدر کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔ سائنس کی ترقی ٹیکنالوجی میں ترقی کا باعث ہوتی ہے اور ٹیکنالوجی انسان کو اتنا اقتدار اور اتنے وسائل عطا کرتی ہے کہ بنی نوع انسان، اقتصادی، سماجی اور ذہنی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لیتا ہے۔ تکنیکی مہارت زندگی میں ایک کمیاتی (Qualitative) تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ روایت اور اس کے تسلسل کا احساس رہتا ہے، مگر روایت کی جبریت، اس کی آمریت باقی نہیں رہتی۔ تخصیص، آفاقی انسان کے بجائے ماہرین پیدا کرتی ہے۔ فرد کی آزادی، بنیادی اہمیت اختیار کرلیتی ہے۔ اس کی صلاحیت، سماج میں اس کے درجے کو متعین کرتی ہے۔ جمہوری تصورات کو ترقی ہوتی ہے اور اقتدار میں عوام کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی، صداقت اور آزادی کے علائم بن جاتے ہیں۔ جدید کاری کا عمل ایک طور پر صنعت کاری کا عمل ہے اور زراعت میں ترقی بھی صنعت کاری کی مرہون منت ہو جاتی ہے۔ ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی تصورات، یہاں تک کہ مذہب کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ سماجی رشتوں میں تبدیلی ہوتی ہے اور خاندان کی وہ مرکزیت باقی نہیں رہتی۔ عورتوں کی آزادی اور ان کی زندگی کے بہت سے شعبوں میں شرکت سے پرانے سماجی اور اخلاقی خیالات کو خاصی زک پہنچتی ہے۔ جامد مشرق، مغرب کی تکنیکی مہارت کی وجہ سے نہ صرف اس سے مغلوب ہو جاتا ہے بلکہ اس کی تقلید پر مجبور ہوتا ہے۔ جدید کاری مغرب کے نقش قدم پر چلنے کے مترادف ہو جاتی ہے۔

لیکن اس ترقی نے کچھ مسائل بھی پیدا کیے ہیں اور جدید کاری کو چونکہ مغرب کے راستے پر چلنے کا دوسرا نام مان لیا گیا ہے، اس لیے مغرب کے

ان مسائل سے اب مشرق بھی دوچار ہے۔ عقلی اور سائنسی نقطہ نظر میں اتنی رعونت آگئی ہے کہ وہ اپنے حدود کو بھلا بیٹھا ہے۔ مادی خوشحالی اور صارفیت (Consumerism) کے فلسفے نے بدن کو بیدار اور روح کو خوابیدہ کر دیا ہے۔ انسان کی مشین پر حکومت نہیں ہے، مشین حاکم ہوگئی ہے۔ جمہوری ادارے، جمہور کی آواز نہیں رہے، حکومت یا سرمائے کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے ہیں۔ فرد کی آزادی کی لے اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر سماجی اور اخلاقی پابندی سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ طاقت کی پرستش نے بے رحمی اور سخت دلی پیدا کی ہے۔ عورت کی بے لگام "آزادی" نے اسے شتر بے مہار بنا دیا ہے اور وہ مردوں سے ہزاروں سال کے ظلم و جبر کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ تعلیم نے مہارت پر زور دیا ہے، سیرت سازی پر توجہ نہیں کی۔ اس نے علم دیا ہے، بصیرت نہیں دی۔ ہنر دیا ہے، نظر نہیں پیدا کی۔ سرمایہ دارانہ سماج، فلاحی ریاست کے ذریعے سے اپنی اصلاح کی ناکام کوشش کر رہا ہے، مگر اشتراکی سماج نے بھی جو عوام کی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، بقول جیلاس ایک نئے طبقے کو جنم دیا ہے جو مادیت اور اقتدار کو سب کچھ سمجھتا ہے اور پرانے تہذیبی ورثے سے صرف ایک عجائب خانے کی زینت کا کام لیتا ہے۔

جدیدیت سے تو مفر نہیں ہے، لیکن جدید کاری کے عمل کو مغرب کے نقش قدم پر آنکھ بند کر کے چلنے سے روکا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جدید دور اور جدید کاری کے مضمرات کو سمجھیں۔ یہ مضمرات جدید سماجوں میں جو کچھ فتوحات ہوئی ہیں ان میں یکسانیت دیکھنا اور اسی طرح دوسرے سماجوں میں جو جدیدیت سے متاثر ہو رہے ہیں، توقعات کی یکسانیت کو مد نظر رکھنا ہیں۔

جو فتوحات یا توقعات کی یکسانیت ہے اس کی بنیاد میں اقتصادی پہلو کی اہمیت مسلم ہے۔ اس لیے اقتصادی ترقی جدید کاری کا ایک اچھا معیار ہے۔

جدید کاری وہ سماجی ماحول پیدا کرتی ہے جس میں ہر شخص کی دولت میں اضافہ کرنے کی اہمیت ہے اور دولت آفریں رویے کو ملحوظ رکھنے اور اس کو عام بنانے کی وجہ سے تمام سماجی قدروں' جیسے طاقت' احترام' محبت' خوشحالی' مہارت اور روشن خیالی کی نئی تشکیل ہوتی ہے اور ان سے نیا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ترقی کے لیے اقتصادی عوامل اور دوسرے عامل میں باہمی رشتوں کے اس احساس کا نام جدید کاری ہے جو ایک طرف عمومی جواز رکھتا ہے اور دوسری طرف ساری دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔

جدید کاری میں اقتصادی نظام کی ترقی پذیری' سیاسی نظام میں عوامی رول اور جمہوری نمائندگی' تہذیب میں عقلی اور دنیوی معیار' سماج میں نقل و حرکت کی آزادی (جو جدوجہد کی تمنائیں اور آرزوئیں پیدا کرے) کی اہمیت مسلم ہے۔ اس طرح جدید کاری صرف اس ترقی کا نام نہیں جو پیداوار اور خرچ میں اضافہ کرتی ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ سماجی اداروں کے ذریعے سے انسانی وسائل کی نئی تنظیم بھی ہے۔ چنانچہ صنعت کاری' شہروں کی طرف میلان' اقتصادی ترقی' روشن خیالی (جو تعلیم اور Mass Media کے ذریعے وجود میں آئے) سیاسی اقتدار میں شرکت اور شخصیت میں تغیر اور تسلسل کا توازن قائم کرنے کی صلاحیت' یہ سب جدید کاری کی ایسی خصوصیات ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ جدید کاری' اہل نظر کی تازہ بستیاں آباد کرنے کا نام بن جاتی ہے اور اس عمل کو اس کی برکتوں کے علاوہ اس کی لعنتوں کے ساتھ ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ صرف برکتوں پر اصرار جتنا غلط ہوگا اتنا ہی لعنتوں پر اصرار بھی۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں ان ملکوں کی آزادی نے جو کل تک مغرب کے غلام تھے' جدید کاری کے عمل کو اتنی تیزی سے روایتی سماجوں تک پہنچا دیا ہے کہ وہ توازن قائم نہیں رکھ سکے۔ اگر یہ عمل

آہستہ آہستہ ہوتا تو شاید تبدیلی اتنی ہوش ربا اور قیامت خیز نہ ہوتی۔ مگر تبدیلی وقت کا تقاضا اور فطرت کا قانون ہے۔ مغربی سماج میں جو مسائل پیدا ہوئے ان کے حل کی طرف توجہ بھی ہے' خواہ اس حل سے ہمیں کتنا ہی اختلاف ہو۔ مگر مشرقی سماجوں کے مسائل میں مغربی حل تمام تر کام نہیں آسکتے' کیونکہ کوئی سماج بیرونی اداروں کو بجنسہ اپنے یہاں نافذ کر کے صحت مند نہیں رہ سکتا' اسے ان اداروں کے تصورات کو اپنے طور پر اپنانا ہوتا ہے۔

چنانچہ اس وقت مشرق' خصوصاً دنیائے اسلام کا مسئلہ یہی ہے کہ اس کا جدید کاری کے عمل سے سابقہ ہے اور اسے وقتی طور پر اپنی فلاح مغربیت ہی میں نظر آتی ہے۔ اگر اس کے روایتی سماج میں جو حرکی عناصر ہیں' ان کی طرف توجہ ہوتی اور جامد عناصر کا غلبہ نہ ہوتا تو وہ اس تبدیلی کے لیے مناسب سانچے وضع کر لیتا اور آنکھ بند کر کے مغربی سانچوں پر تکیہ نہ کرتا' مگر اس کے یہاں اس تبدیلی کے لیے ذہنی آمادگی تو کیا' ایک قسم کا خوف ہے۔ اپنے خول میں سکڑنے کا وطیرہ ہے' پھیلنے اور پھیلانے' خدا کی زمین میں ہاتھ پاؤں مارنے کا عزم نہیں ہے۔ تجربے سے جھجک ہے' ایسے علم سے ہراس ہے جو مسائل اور مشکلات پیدا کرے' آگے دیکھنے کی امنگ نہیں ہے' صرف پیچھے دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ تبدیلی کو قبول کرنے سے پس و پیش ہے' ہاں چاروناچار تبدیل ہو جانے کو قسمت کا کھیل سمجھ کر گوارا کرنے کی عادت ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نفسیاتی گرہ' سماجی پس ماندگی اور ذہنی جمود کے لیے سہارا اسلام سے لیا جاتا ہے' جو دنیا کو آخرت کی کھیتی کہہ کر صاف کہتا ہے کہ دنیا انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ جو فطرت کے مشاہدے کو اور خدا کی نشانیوں کو ضروری سمجھتا ہے۔ جو ایک منصفانہ سماج اور ایک اخلاقی نظام کو مرکزی اہمیت دیتا ہے' جو علم کے حصول پر کوئی حد مقرر نہیں کرتا۔ جو مساوات انسانی کا علمبردار ہے۔ جو مرد اور عورت کی برابری کا قائل ہے۔ جو بھائی

چارے، اخوت اور انسانی برادری پر زور دیتا ہے۔ جو امن و آشتی کی تلقین کرتا ہے۔ جو عقیدے اور عبادت کے ساتھ ساتھ معاملات میں عدل و انصاف پر اصرار کرتا ہے، جو فرد کو عمل پر اکساتا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیت کو بیدار کرتا ہے۔ جو حقوق اللہ کے ساتھ، حقوق العباد کو ضروری سمجھتا ہے۔ جو دولت کے چند افراد یا گروہوں کا اجارہ ہونے کی قطعی طور پر خلاف ہے، جو زمین کو خدا کی ملکیت سمجھتا ہے، جو جمہوریت پسند ہے۔ جو اپنی تعلیم کی ابدیت کے باوجود، وقت اور حالات کی تبدیلی میں اجتہاد کے لیے دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حقیقی اسلام اور تاریخی اسلام میں فرق نہیں کیا گیا۔ حقیقی اسلام اپنے کو خدا کے حوالے کرنے کا نام ہے، اور آج عام طور پر اسلام کے معنی اسلام کی پوری تاریخ کے لیے جاتے ہیں، جس میں ظاہر ہے، اس طویل عرصے میں بہت سے غیر اسلامی عناصر بھی شامل ہوگئے ہیں۔ اس میں شہنشاہیت اور اس کے ظلم و جبر کی خونین داستانیں بھی ہیں اور تصوف کی وہ بے اعتدالیاں بھی ہیں جو مزاج خانقاہی کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں۔ پھر جاگیرداری کے دور کی وہ روایات بھی ہیں جن میں سے بہت سی فرسودہ ہوگئی ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جدید کاری کے عمل سے نہ تو اس طرح مرعوب ہوں کہ آنکھ بند کر کے مغرب کے راستے پر گامزن ہو جائیں اور نہ اس سے اس طرح دامن بچائیں۔ گویا یہ گمراہی اور پستی، شیطنت اور بے راہ روی کا دوسرا نام ہے بلکہ اس زریں اصول پر عمل کریں جو "خذ ما صفا، دع ماکدر" کے مقولے میں پوشیدہ ہے۔

یہ بات اب کھل کر سامنے آگئی ہے کہ مادیت کے فروغ نے دولت کی ہوس پیدا کی ہے اور اس دولت کی ہوس نے بہت سی سماجی اور اخلاقی بدعنوانیوں کو جنم دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان اسلامی ممالک میں بھی جہاں تیل کی وجہ سے دولت کی فراوانی ہے، ایک انتشار پیدا ہوا ہے اور اوپر کی اسلامی

زندگی کے اندر بہت سی اخلاقی خرابیاں وجود میں آگئی ہیں۔ اس لیے ہر ایسے سماجی نظام کے قیام کی خواہش، جس میں دولت چند افراد یا حکومت کے چند افراد کے ہاتھ میں نہ ہو، بلکہ سب کو اس کا مساوی حصہ ملے، عین اسلامی ہے۔ اسلامی سوشلزم اور کمیونزم میں صرف یہ فرق ہی اہم نہیں کہ اس میں تاریخی مادیت اور اس کی بنا پر لامذہبیت کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس میں صارفیت یا Consumerism پر توجہ ہے، جب کہ اسلام سادگی اور ایک طرح کی پرہیزگاری یا تقویٰ (Asceticism) سکھاتا ہے۔ اس زہد اور مسیحی زہد میں فرق یہ ہے کہ اسلامی زہد دنیا کو قبول کرتا اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں پر سب کا حق سمجھتا ہے، جبکہ مسیحی زہد ترک دنیا کی تلقین کرتا ہے اور زندگی کو بھی ایک گناہ سمجھتا ہے۔

پھر اسلام، جمہوری طرز حکومت کے حق میں ہے۔ جمہوری طرز حکومت یا جمہوری ادارے، مغرب کی جاگیر نہیں، انسانی ادارے ہیں۔ لیکن مغرب میں جمہوریت کا جس طرح فروغ ہوا ہے، وہ وہاں کے مخصوص تاریخی حالات کی وجہ سے ہوا ہے اور ہم اگر اس بات کو پھر دہرائیں کہ کوئی ادارہ بجنسہ کہیں سے لایا جائے تو اس سے الجھنیں پیدا ہوں گی اور اگر اس کو اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں اپنی تاریخ اور اپنے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے طور پر نافذ کیا جائے تو اس سے فلاح کی صورت یقیناً نکلے گی۔ اس لیے مغربی جمہوریت کی بجنسہ تقلید لازمی نہیں ہے بلکہ اس کی روح کے لیے مشرقی قالب کی ضرورت ہے۔ موجودہ پارلیمانی نظام کی اصلاح اسی ذیل میں آتی ہے۔

جدید کاری میں بینک کاری کو جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے۔ سرمایہ داری اور صنعت کاری کے فروغ میں اس کا جو رول ہے، وہ مسلم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا سود سرے سے ناجائز ہے، یا سود اور سود مرکب یا ربا میں فرق ہے، جس سے سود خوری (Usury) وجود میں آتی ہے۔ دنیا میں مسلمان

اقلیت میں ہیں، اکثریت میں نہیں۔ وہ سود دینے پر ایک طرح مجبور ہیں، مگر سود لینا ان کے لیے نامناسب ہے۔ ہمارے علما اس صورت حال میں ہماری کتنی رہ نمائی کرتے ہیں؟ فقہ اسلامی میں قیاس، اجماع اور اجتہاد، تینوں کی روایت موجود ہے۔ کیا اس سے پورا پورا کام لیا گیا ہے؟ شریعت، جو ڈسپلن قائم کرتی ہے، اس کی ضرورت مسلّم ہے اور اس ڈسپلن کے بغیر انتشار فطری ہے۔ مگر اس ڈسپلن کے پیچھے ایسی نظر بھی ضروری ہے جو قدیم و جدید، ماضی و حال دونوں سے گہری واقفیت رکھتی ہو۔ مذہب صرف اوامر و نواہی کا نام نہیں ہے، صرف چند قوانین کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس کی ایک روح ہے، اس میں ایک عقیدے، ایک ایمان، ایک جذبہ تسلیم، ایک عشق الٰہی، ایک عشق رسولؐ کی مرکزیت ہے جس کے لیے وقت کی ضرورت کے مطابق قوانین پر اصرار ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام کے ابدی اصولوں کی روشنی میں قانون وراثت، تعدد ازدواج اور حدود شرعی پر برابر غور کرنے اور ان کی روح کے مطابق ان کی عملی تعبیروں کی ضرورت بہرحال مسلّم ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ناقص ہے۔ اس نے دو الگ الگ دھاروں کو چلنے دیا ہے۔ ایک طرف ایک بڑی رو ان تعلیمی اداروں کی ہے جو روزگار مہیا کرنے اور دنیا میں جگہ بنانے کے لیے ہیں۔ گو وہ اب اس مقصد میں بھی خاصے ناکام ہیں۔ دوسرے وہ قدیم ادارے ہیں جو مذہبی تعلیم دیتے ہیں اور اس تعلیم میں درس نظامیہ کے نہج پر اصرار کرتے ہیں جو قرآن اور حدیث کے علاوہ قدیم علوم اور قدیم طرز فکر (Methodology) کو کافی سمجھتے ہیں۔ ان ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو قرآن اور اسلامی اخلاق کی تعلیم کے ساتھ جدید طبیعیاتی علوم، معاشیاتی علوم، سماجی علوم اور انسانی علوم کی تعلیم دیں اور یہاں اسلامی تعلیم صرف دینیات کو لازمی قرار دینے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ اسے دوسرے علوم کے

ساتھ موجودہ ذہن کی ضروریات کے مطابق حرز جان بنائے۔ ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، عام اداروں میں مذہبی تعلیم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے مسلم رہ نماؤں، مسلم اداروں اور اوقاف کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان اداروں کے طالب علموں کے لیے ایسے جزوقتی ادارے قائم کریں جن میں اس کمی کو پورا کیا جاسکے۔ مسلم سکولوں اور کالجوں میں رسمی طور پر دینیات کی تعلیم کافی نہیں۔ یہاں دنیوی علوم کی تعلیم کے ساتھ اسلامی بنیاد کو مضبوط کرنے کے لیے تدریس کے اوقات میں اضافے کو صرف قبول ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس پر اصرار کرنا چاہیے۔

ایسا لگتا ہے کہ اسلام مسلمانوں سے مایوس نہیں ہوا ہے بلکہ مسلمان اسلام سے مایوس ہوگئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آج عالم اسلام میں ایک بیداری، ایک احیا، ایک نئی زندگی کے آثار ہیں، مگر یہ تیل کی طاقت مادی وسائل اور اسلحہ کی فراہمی میں اسیر لگتی ہے۔ اس بیداری میں دانش وری کی کمی ہے۔ ہندوستان کو دیکھیے تو اس کا دستور اور اس کا جمہوری نظام نہ صرف ہر شہری کو اس نظام میں شرکت کی ضمانت دیتا ہے بلکہ اپنے عقائد اور تعلیمات کو عام کرنے کی بھی۔ اس اصول کے نفاذ میں تاریخی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر بہت سی دشواریاں ہیں، جو مسلم ہیں۔ پھر بھی بنیادی دستوری ضمانتوں کی کلید، بہرحال موجود ہے۔ مگر دانش وری کی روایات کے ضعیف ہونے کی وجہ سے کچھ حلقوں میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جب تک طاقت ہاتھ میں نہ ہو، اسلامی مشن کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ لوگ صرف اسلام کے مدنی دور کو سامنے رکھتے ہیں، اس کے مکی دور کو جو مدنی دور سے پہلے تھا، مناسب اہمیت نہیں دیتے۔ سرسید کے دور سے ہمارے یہاں دانش وروں کی جو روایت شروع ہوئی وہ اب بھی خاصی کمزور ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ علمی اور عقلی نقطہ نظر کو فروغ ہو، فکر روشن زندگی اور عمل کا سہارا ہو، اور فکر و عمل کے لیے راہ ہموار کرے۔ یہ

دانشوری صرف قدیم علوم کے سہارے ممکن نہیں اور جدید علوم بھی سچی دانش وری کی راہ نہیں دکھاتے' اسے یک رخا بنا دیتے ہیں۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایسی دانش وری کی ضرورت ہے جو بقول اقبال' کہنہ پیکر میں نئی روح آباد کرے یا کہن روح کی تقلید سے آزاد کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے لیے دانش وری وہی ہوگی جو ہماری مذہبی قدروں سے نہ صرف واقف ہو' بلکہ ان پر ایمان رکھتی ہو' اور جدید دور' جدید علوم اور جدید زندگی کے سارے تقاضوں سے خائف ہونے کے بجائے ان کا معروضی طور پر جائزہ لے سکتی ہو' اور ان کے ذریعے سے انسان کو جو طاقت میسر آتی ہے اس سے صحیح طور پر کام لینے کا گر جانتی ہو۔

اسلام جب دنیا میں پھیلا ہے تو اس نے دوسرے علاقوں' قوموں اور تہذیبوں کو متاثر بھی کیا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوا ہے۔ یہ ذہن ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں عام نہیں ہے۔ وہ مذہب سے زیادہ مذہبیت پر زور دیتے ہیں۔ یہ تشخص کے معنی علاحدگی پسندی سمجھتے ہیں۔ یہ مذہبی ارکان کی بجاآوری کو تو ضروری سمجھتے ہیں' مگر دنیوی معاملات میں اسلام کے اصولوں کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے اور دیانت' ایمانداری' رفاہ عام' خدمت خلق' سماجی بہبود کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ اسلام کی جامعیت کو بھلا دینے کے مترادف ہے۔ سرسید نے غلط نہیں کہا تھا کہ "دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی' مگر دنیا چھوڑنے سے دین بھی جاتا ہے۔" اسلام دین اور دنیا دونوں کو ملحوظ رکھتا ہے اور دونوں کے ساتھ انصاف کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

سولھویں صدی عیسوی تک مسلمان علمی دنیا میں نمایاں رہے۔ اس کے بعد مغرب نے علمی دنیا کی قیادت سنبھالی۔ یہ اسلام کا قصور نہیں' مسلمانوں کا قصور ہے۔ اسلام میں وقتاً فوقتاً احیا اور بیداری کی جو تحریکیں اٹھی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں یہ اندرونی طاقت موجود ہے کہ وہ نئے

حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق اپنی از سرنو تنظیم کرسکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک طرف ہم حقیقی اسلام کو سمجھیں اور دوسری طرف دانشوری کی روایت کو مضبوط کر کے تنگ نظری، تعصب، توہمات، رواج پرستی، اندھی ماضی پرستی کی دلدل سے نکلیں۔ حقیقی اسلام زندگی کے ہر موڑ پر ہماری رہ نمائی کرسکتا ہے۔